بسم اللہ الرحمن الرحیم

اشارات

کامل ایک سال ملتوی رہنے کے بعد "ترجمان القرآن" کی اشاعت کا سلسلہ اب پھر شروع ہو رہا ہے۔ پچھلے سال آخری پرچہ رجب ۶۶ھ کا شائع ہوا تھا۔ پھر مشرقی پنجاب سے مسلمانوں کے قومی اخراج کا تاریخی سانحہ پیش آگیا۔ ساری قوم کے ساتھ ہم کو بھی دارالاسلام (جمال پور پٹھان کوٹ) سے نکلنا پڑا۔ لاہور آنے کے بعد قانون کے مطابق رسالہ کا نیا ڈکلیریشن داخل کرنا ضروری تھا، چنانچہ اس کی درخواست کردی گئی۔ لیکن مغربی پنجاب کی حکومت نے کئی مہینے تک ہماری درخواست منظور نہ کی۔ یہ وجوہ تھے جن کی بنا پر اتنی مدت تک یہ رسالہ شائع نہ ہوسکا۔ ہمیں امید ہے کہ ناظرین ترجمان القرآن ہماری ان مجبوریوں کو پیش نظر رکھ کر اس طویل التوا کو معاف فرمائیں گے۔

پچھلے سال ہماری آنکھوں نے جو ہولناک انقلاب دیکھا ہے اس نے تمام ان انقلابات کو مات کردیا ہے جو اس سے پہلے نہ صرف ہمارے اس ملک میں بلکہ دنیا کے کسی ملک میں پیش آئے ہیں۔ ممکن ہے کہ انسانی جانوں کا اتلاف اس سے پہلے کسی جنگ میں اس سے بھی زیادہ وسیع رقبہ پر ہوا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے پہلے بھی اس سے زیادہ بڑی آبادیوں کو ان کے آبائی وطنوں سے اکھاڑ پھینکا گیا ہو۔ مگر شاید اس سے پہلے کبھی اور کہیں انسان نے انسان کے ساتھ اتنے بڑے پیمانے پر ایسی سنگدلانہ درندگی اور ایسی بے شرمانہ بہیمیت کا برتاؤ نہیں کیا ہے۔ قوموں میں دشمنیاں بھی ہوئی ہیں، ملکوں میں خانہ جنگیاں بھی ہو چکی ہیں، لیکن غالباً کبھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان عداوت نے یہ شدت، یہ

تلخی اور یہ تندی اختیار نہیں کی ہے۔ انسان انسان سے بارہا لڑا ہے، مگر لڑائی میں کمینہ پن اور بدمعاشی کا جو مظاہرہ یہاں ہوا ہے، یہ اپنی نظیر بس آپ ہی ہے۔ یہاں انسان صورت جانوروں نے وہ وہ کام کئے ہیں کہ اگر کتوں اور بھیڑیوں پر ان کا الزام تھوپ دیا جائے تو وہ بھی اسے اپنی توہین محسوس کریں۔ اور یہ کرتوت چند گنے چنے بدمعاشوں کے نہیں تھے بلکہ پوری پوری قوموں نے اپنے آپ کو بدمعاش ثابت کیا، باقاعدہ حکومتیں بدمعاش بن گئیں، بڑے بڑے لیڈروں اور رئیسوں اور وزیروں نے بدمعاشی کی اسکیم سوچی اور حکومتوں کے پورے نظم ونسق نے اپنے مجسٹریٹوں اور اپنی پولیس اور اپنی فوج کے ذریعہ سے اس اسکیم کو عملی جامہ پہنایا۔ دو سال پہلے تک ہمیں اندازہ نہیں تھا کہ جس ملک میں ہم رہتے ہیں اس کی آبادی کا اخلاقی زوال اس انتہا کو پہنچ چکا ہے۔ نفیس لباسوں، اعلیٰ ڈگریوں اور بڑے ناموں کے پردے میں جو شخصیتیں چھپی ہوئی تھیں ان کو ہم شرفا میں شمار کرتے تھے۔ عام آبادی کے پر امن رویے کو دیکھ کر ہم سمجھتے تھے کہ یہ بھلے انسانوں کی بستیاں ہیں۔ مگر افسوس کہ واقعات نے اس سارے حسن ظن کا پردہ چاک کر دیا۔ معلوم ہوا کہ پہلے جو کچھ ہم دیکھ رہے تھے وہ محض انگریز کی سنگین کا کرشمہ تھا۔ اس سنگین کے ہٹتے ہی یہ حقیقت کھل گئی کہ یہ ملک لاکھوں کروڑوں ڈاکوؤں، لٹیروں، قاتلوں، زانیوں اور سخت کمینہ صفت ظالموں سے بھرا ہوا تھا۔

کیا یہ سب کچھ جو واقع ہوا محض ایک اتفاقی حادثہ تھا؟ ــــ جو لوگ پچھلے تیس سال سے اس ملک کی رہنمائی کرتے رہے ہیں، اور جن کی قیادت میں یہ انقلاب رونما ہوا ہے، وہ ایسا ہی کچھ ثابت کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ وہ اس فساد عظیم کے اسباب کی بحث کو باتوں میں ٹالنا چاہتے ہیں۔ وہ اس کی ایک شاعرانہ توجیہ ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں کہ کشت وخون اور ظلم وستم کا یہ مظاہرہ کوئی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس پر کچھ فکرمند ہونے کی ضرورت ہو، یہ تو ایک آزاد قوم کی ولادت کے درد ہیں جو ایسے موقع پر ہوا ہی کرتے ہیں۔ حالانکہ اگر یہ ولادت کے درد ہی تھے تو یہ دنیا کو ایک درندے کی پیدائش کی خوشخبری دے رہے تھے نہ کہ ایک انسان کے تولد کی۔ انہوں نے دنیا کو جو اطلاع دی

وہ اس بات کی نہ تھی کہ کچھ انسان ہیں جن کا بندِ اسیری ٹوٹا ہے بلکہ دراصل یہ اس بات کی اطلاع تھی کہ کچھ بھیڑیے قید تھے جن کا پنجرہ کھل گیا ہے۔ اس کے بعد لازماً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ہندوستان کے باشندے اپنی فطرت اور اپنے مزاج ہی کے لحاظ سے کمینے، بدمعاش اور سفاک ہیں، یا ان کو ایسا بنا دیا گیا ہے؟ پہلا الزام ثابت کرنے کے لئے اس سے زیادہ قوی ثبوت کی ضرورت ہے جو پچھلے دو سال کے واقعات نے فراہم کیا ہے۔ آخر ہندوستانیوں کی پچھلی سینکڑوں برس کی تاریخ موجود ہے۔ اپنے ماضی میں انہوں نے کب ایسی ذلیل صفات کا مظاہرہ کیا تھا؟ پھر اگر یہ الزام ثابت نہیں ہے تو یقیناً دوسرا الزام آپ سے آپ ثابت ہے، یعنی یہ کہ ہمارے ملک کی آبادی کو اس اخلاقی پستی کے گڑھے میں گرایا گیا ہے۔ یہی وہ نتیجہ ہے جس سے بچنے کے لئے پچھلے دردناک واقعات کے اسباب کی بحث کو باتوں میں اڑانے کی کوشش کی جاتی ہے، کیونکہ یہ بحث ان سب لوگوں کا منہ کالا کر دینے والی ہے جنہوں نے پچھلی ربع صدی میں ہمارے ملک کی سیاسی تحریکوں کی قیادت فرمائی ہے

ہندوستان میں سیاسی بیداری کی ابتدا مغربی تعلیم و تہذیب کے زیر اثر ہوئی۔ اس تعلیم اور تہذیب نے دو تحفے ہمارے ملک کے کارفرما دماغوں اور کارکن ہاتھوں کو دے۔ ایک قومیت کا احساس اور قوم پرستی کا جذبہ۔ دوسرے مادہ پرستانہ اخلاق۔

پہلی چیز کو لیکر یہاں کے سیاسی لیڈروں نے "ہندوستانی قومیت" کا ایک مصنوعی تخیل پیدا کرنے کی کوشش کی، مگر چونکہ اس کے لئے کوئی حقیقی بنیاد موجود نہ تھی اس لئے قومیت کی حس بیدار کرنے کی جتنی کوششیں کی گئیں ان کا نتیجہ یہ ہوا کہ یہاں اُن مختلف گروہوں میں اپنی جداگانہ قومیتوں کا شعور جاگ اٹھا جو فی الحقیقت اپنے اندر قومیت کے فطری عناصر رکھتے تھے۔ اس طرح چالیس پچاس سال کی تبلیغ قومیت نے اس ملک میں ایک کے بجائے بہت سی چھوٹی بڑی قومیتیں پیدا کر دیں جن میں سے تین ——— یعنی ہندو قومیت، مسلم قومیت اور سکھ قومیت ——— تو پوری طرح برسرکار آکر اپنا کھیل کھیل چکی ہیں، اور باقی بہت سی صوبائی اور لسانی قومیتیں ابھی دوران

تخلیق میں ہیں۔ پھر سیاسی اختیارات حاصل کرنے کے لئے برطانوی اقتدار کے خلاف جدوجہد ہوتی گئی اس کا قدم جتنا جتنا آگے بڑھتا گیا، ان مختلف قومیتوں کے درمیان آپس کی کشمکش اتنی ہی تیز تر اور تلخ تر ہوتی چلی گئی۔ اس کشمکش نے ان میں سے ہر ایک کے اندر قوم پرستی کا شعلہ بھڑکا دیا، اور ایک کی طرف سے دوسرے کے قومی حوصلوں کی مزاحمت جتنی بڑھی اتنی ہی قومی عداوت ان کے درمیان بڑھتی چلی گئی۔

دوسری طرف مادہ پرستانہ اخلاق کا جو درس مغربی تعلیم و تہذیب سے لیا گیا تھا وہ باولے کتے کے زہر کی طرح سارے ملک کی رگ رگ میں پھیل گیا۔ اس نے دلوں کو خدا ترسی اور حق شناسی سے خالی کر دیا شرافت اور انسانیت کی جڑیں ہلا دیں، اور ان تمام اخلاقی قدروں کو ختم کر دیا جو اس ملک کے لوگوں نے اپنے قدیم مذاہب سے پائی تھیں۔ یہ اس نئے اخلاق ہی کا کرشمہ تھا کہ پچھلے پچیس سال میں ہندوؤں مسلمانوں اور سکھوں کی قومی کشمکش روز بروز زیادہ سے زیادہ رذالت کے راستوں پر بڑھتی چلی گئی۔ بڑے بڑے لیڈروں نے بے حیائی کے ساتھ ایک کھل کھیل کر قومی خودغرضیوں کے تقاضے پورے کئے، بڑی بڑی ذمہ دار سیاسی جماعتوں نے حق اور انصاف سے بے نیاز ہو کر ایک دوسرے کے خلاف جوڑ توڑ کئے، ملک بھر کے اخبارات نے انتہائی بے شرمی کے ساتھ جھوٹے پروپیگنڈے کئے، گالم گلوچ کا طوفان بپا کیا، بغض و نفرت و عداوت کی شراب پلا پلا کر اپنی اپنی قوموں کو بدمست کر دیا، پھر دونوں مخالف گروہوں کے افراد نے سرکاری محکموں میں، منڈیوں اور بازاروں میں، اور زندگی کے ہر کاروبار میں ایک دوسرے کے خلاف کھلی کھلی بے انصافیاں اور حق تلفیاں کیں اور ہر اس بے ایمانی کو اپنے لئے نیکی اور کار ثواب بنا لیا جو حریف قوم کے کسی فرد کے ساتھ کی جائے۔ واقعات کی یہ رفتار صاف بتا رہی تھی کہ اس ملک کا اخلاقی زوال کس پستی کی طرف بہا چلا جا رہا ہے۔

یہی دو اسباب ہیں جنہوں نے مل جل کر وہ ہولناک نتائج پیدا کئے جو ہماری آنکھیں ابھی ابھی دیکھ چکی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری سے وہ لوگ بری نہیں ہو سکتے جو اس دور میں یہاں کی مختلف قوموں کے رہنما اور سربراہ کار رہے ہیں۔ یہی تو وہ لوگ ہیں جنہوں نے ایک طرف اپنی اپنی قوم کے لوگوں میں قومی خواہشات برانگیختہ کیں اور دوسری طرف قومی اخلاق کو سنبھالنے کے لئے کچھ نہ کیا۔ بلکہ صحیح یہ ہے کہ اسے گرایا اور گرانے میں خود اس کی پیشوائی

لی۔ اگر یہ اس کھیل کے نتائج سے بے خبر تھے تو سخت اناڑی تھے۔ ایسے اناڑی اس قابل نہیں ہیں کہ کروڑوں انسانوں کی قسمتوں کے ساتھ بازی گری کرنے کے لئے انہیں چھوڑ دیا جائے۔ اور اگر انہوں نے جان بوجھ کر یہ سارا کھیل کھیلا تو درحقیقت یہ انسانیت کے، اور خود اپنی قوم کے دشمن ہیں، ان کا صحیح مقام پیشوائی کی مسند نہیں بلکہ عدالت کا کٹہرا ہے جہاں ان کے اعمال کا محاسبہ ہونا چاہیئے۔

یہ خیال کرنا سخت حماقت ہے کہ جو کچھ ہو گذرا وہ اس قومی کشمکش کا آخری باب تھا، اور یہ کہ اب تقسیم ملک کے بعد تاریخ ایک صحیح راستے پر چل پڑیگی۔ ہرگز نہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ ۱۵ اگست ۴۷ء کی تقسیم سے یہاں جو دو مملکتیں بنی ہیں، انہوں نے قومی خود غرضی اور اخلاقی پستی کا وہ سارا زہر میراث میں پایا ہے جو قبل تقسیم کے ہندوستان کی رگ رگ میں سرایت کر چکا تھا۔ اور ان دونوں مملکتوں کی پیدائش کا آغاز جن بدبخت حالات میں ہوا ہے وہ ان کی آئندہ تاریخ پر اثر ڈالے بغیر نہیں رہ سکتے۔ نئی سیاسی سرحد کے دونوں جانب جو دو قومیں آباد ہیں ان کے دل ایک دوسرے کے خلاف انتقام اور عداوت کے تلخ ترین جذبات سے لبریز ہیں ــــ خصوصاً سکھوں اور مسلمانوں کے درمیان تو وہ دشمنی پیدا ہو چکی ہے جو شاید اس وقت کہیں بھی دنیا کی دو قوموں کے درمیان نہیں پائی جاتی ــــ مسلمان، ہندو اور سکھ ایک دوسرے کو وہ چرکے لگا چکے ہیں جن کے زخم مدتوں رستے رہینگے۔ اور اب وہ کسی غیر قوم کے ماتحت بے بس نہیں ہیں بلکہ اپنی اپنی آزاد مملکتیں رکھتے ہیں۔ اگر اب ان دونوں مملکتوں کے باشندوں کو ہوش نہ آیا، اگر اب بھی ان کی لیڈرشپ تبدیل نہ ہوئی اور اگر اس نئے دور میں بھی ان کے معاملات اسی اندھی اور گندی قوم پرستی پر اور اسی مادہ پرستانہ اخلاق پر چلتے رہے جس پر اب تک وہ چلے ہیں، تو آئندہ ان با اختیار قوموں کی کشمکش بہت زیادہ بڑے پیمانے پر بدرجہا زیادہ تلخ نتائج پیدا کریگی۔ پہلے جو گالم گلوچ اخباروں کے کالموں میں ہوتی تھی وہ اب بین الاقوامی پروپیگنڈے پر ہو گی۔ پہلے جو چھوٹے چھوٹے معرکے دفتروں اور منڈیوں میں برپا ہوا کرتے تھے اب وہ دو سلطنتوں کے درمیان سیاسی رسہ کشی اور معاشی رقابت کی شکل میں برپا ہونگے۔ اور پھر اگر خدانخواستہ ان دونوں قوموں کے درمیان کبھی جنگ ہو گئی تو یقیناً وہ ایسی سخت انتقامی جنگ ہو گی جو اپنی وحشت و بربریت

میں تاریخ انسانی کی بدترین لڑائیوں کو بھی مات کردیگی۔

لہٰذا اب پاکستان اور ہندوستان دونوں کے مستقبل کی بہتری کا انحصار اس بات پر ہے کہ اگر ان کی آبادیوں میں شریف معقول اور خداترس انسانوں کا کوئی عنصر موجود ہے تو وہ منظم ہو کر اٹھے، اپنی اپنی قوم کی ہیئت بدلنے کی کوشش کرے، اور موجودہ قیادتوں کو بدل کر ایسے طریقے پر دونوں ملکوں کے معاملات چلائے جس سے ان کے تعلقات شریفانہ ہمسائگی اور منصفانہ تعاون پر قائم ہو سکیں۔

اب ذرا ایک نظر تقسیم کے اُس ڈرامے پر بھی ڈال لیجیے جو پچھلے سال یہاں کھیلا گیا ہے، تاکہ آپ کو اُن لیڈروں کی سیاسی دانائی کا حال معلوم ہو جائے جن کی مہارتِ فن کا شہرہ ایک مدت سے ہم سن رہے تھے۔ اس ڈرامے کے اصل اداکار تین تھے، انگریز، کانگریس، اور مسلم لیگ۔ ان تینوں کے کام کا جائزہ لیکر ہمیں دیکھنا چاہیے کہ ان میں سے ہر ایک نے اپنے آپ کو کیا ثابت کیا ہے۔

انگریزوں کے لئے جنگِ عظیم کے پیدا کردہ مسائل اور ہندوستان کی سیاسی بیداری نے جو سوال پیدا کر دیا تھا وہ یہ تھا کہ آیا اس ملک پر آخر وقت تک قاہرانہ تسلط رکھا جائے یہاں تک کہ زبردستی نکالے جانے کی نوبت آجائے، یا وہ وقت آنے سے پہلے ہی باہمی رضامندی سے یہ ملک چھوڑ دیا جائے۔ پہلی صورت میں وہ مزید چند سال تک اس ملک پر قبضہ رکھ سکتے تھے، مگر اس عارضی فائدے کا مستقل نقصان یہ تھا کہ زبردستی نکالے جانے کے بعد انہیں ان تمام فائدوں سے ہمیشہ کے لئے ہاتھ دھولینا پڑتا جو ہندوستان سے اٹھائے جا سکتے تھے۔ دوسری صورت میں برٹش امپائر کا بظاہر خاتمہ تھا، مگر آزاد ہندوستان سے فائدہ اُٹھانے کے امکانات باقی رہتے تھے۔ ان دونوں صورتوں کے فوائد اور نقصانات کا موازنہ کر کے انگریزی قوم نے ٹھنڈے دل سے دوسری صورت کو انتخاب کیا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ تاریخ اور نفسیات کے اس سبق سے بھی غافل نہ تھی کہ جو قوم کسی دوسری قوم کی غلامی سے آزاد ہوتی ہے اس کے اندر مدتوں تک اُس قوم کے خلاف شدید تعصب بلکہ انتقام کا جذبہ بھڑکتا رہتا ہے جو اس پر جبر و قہر سے حکومت کرتی رہی ہو۔ اس لیے

اپنے مفاد کی خاطر یہ ضروری سمجھتی تھی کہ ہندوستان کا معاملہ ایسے طریقہ سے طے کیا جائے جس سے تعصب انتقام کے وہ سارے جذبات جو اس کے خلاف بھڑک سکتے تھے خود ہندوستانیوں کے درمیان آپس میں ایک دوسرے کی طرف متوجہ ہو جائیں اور انگریز دونوں کا یار غار بن کر رہے۔ اس غرض کے لئے برطانوی حکومت نے پہلے لارڈ ویول کو استعمال کرنا چاہا، مگر معلوم نہیں کہ وہ چالاکم تھا یا شریف زیادہ، بہر حال وہ تاریخ انسانی کی عظیم ترین سیاسی بدمعاشی کا وہ کام انجام نہ دے سکا جو اسکی قومی حکومت اس سے لینا چاہتی تھی۔ آخر کار نگاہ انتخاب لارڈ ماؤنٹ بیٹن پر جا کر ٹھہری اور اس شخص نے آکر تقسیم ہند کا پورا نقشہ ایسے طرز پر بنایا جو لازمی اور قطعی طور پر وہی نتائج پیدا کر سکتا تھا جو اس نے فی الواقع پیدا کیے۔ کلکتہ، نواکھالی، بہار، گڑھ مکتیشور، راولپنڈی اور امرتسر کے واقعات کے بعد تقسیم ملک اور انتقال اختیارات کا جو ڈھنگ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اختیار کیا اس کو دیکھ کر ایک معمولی عقل و بصیرت رکھنے والا آدمی بھی یہ اندازہ کر سکتا تھا کہ اس سے ملک کے ایک بڑے حصے میں سخت خونریزی ہو کر رہیگی۔ اب اگر یہ ماؤنٹ بیٹن کا اناڑی پن تھا اور کوئی دانستہ چالاکی نہ تھی جسے اسکی قوم کی رضامندی حاصل ہوتی، تو جو ہولناک نتائج اس سے برآمد ہوئے انہیں دیکھ لینے کے بعد بجائے اسکے کہ اس شخص پر تحسین و آفرین کے پھول برسائے جاتے، اس پر لعنت ملامت کی بوچھاڑ ہونی چاہیئے تھی اور لاکھوں انسانوں کے قتل اور ایک کروڑ سے زیادہ انسانوں کی خانہ بربادی کے بدلے میں اس پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جانا چاہیئے تھا۔ لیکن اس کی سیاست دانی کی جو داد انگلستان میں دی گئی وہ اس بات کا صریح ثبوت ہے کہ یہ سب کچھ دانستہ کیا گیا تھا اور اسے پوری انگریزی قوم کی رضامندی حاصل تھی۔ آج یہ اسی چالاکی کا کرشمہ ہے کہ ہندو اور مسلمان اور سکھ ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں، اور وہ انگریز جو کل تک تینوں پر یکساں ظلم کر رہا تھا تینوں کا مشترک دوست ہے، مسلمان کے لئے ہندوستان کی اور ہندو اور سکھ کے لئے پاکستان کی زمین تنگ ہے مگر انگریز کے لئے ہر جگہ فراخی ہی فراخی ہے۔ انسانیت کے نقطۂ نظر سے آپ چاہے اسکو کتنا ہی بڑا جرم قرار دے لیں، انگریز کی قومی خود غرضی کے لحاظ سے یہ بالیقین ایک کامیاب ترین سیاسی چال تھی مگر یہ فیصلہ کرنا مشکل ہے کہ اس پر زیادہ داد کا مستحق کون ہے: لارڈ ماؤنٹ بیٹن یا ہندوستان کے وہ اندھے سیاسی لیڈر جو تقسیم کے اس نقشے کی ساخت اور تکمیل میں ہر مرحلے پر اس کے شریک کار رہے!

باقی صفحہ ۶ پر دیکھیں

اس ڈرامے کی مصری اداکار کانگریس تھی اور داس نے جو پارٹ ادا کیا وہ احمقوں کے سوا کسی سے واد نہیں سکتا۔ تقسیم ہند سے دو تین برس پہلے ہی یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اب تقسیم کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ اسکے دو راستے کھلے ہوئے تھے۔ ایک راستہ یہ تھا کہ تلخی اور بدمزگی کے بڑھنے سے پہلے ہی اس چیز کو سیدھی طرح قبول لیا جاتا جو ناگزیر ہو چکی تھی اور بھلے آدمیوں کی طرح بیٹھکر سارے معاملات ایسے طریقہ سے طے کر لئے جاتے کہ مرل جانے یا کم انکم شریف ہمسایوں کی طرح رہنے کے مواقع باقی رہتے۔ دوسرا راستہ یہ تھا کہ ڈرے کے رہینگے" اور ہرگز دینگے کے اس جھگڑے کو انتہائی تلخی کی حد تک بڑھنے دیا جاتا اور اس ناگزیر تقسیم کو ایسے مرحلے پر پہنچ کر قبول کیا جاتا جہاں ف ہونے والی قوموں کے درمیان دوستانہ تو درکنار شریفانہ انسانی تعلقات برقرار رہنے کے امکانات بھی ختم ہو جاتے۔ کانگریسی بڈروں نے ان دونوں راستوں میں سے دوسرے راستے کو انتخاب کیا۔ اس کی وجہ اگر نادانی تھی تو بدقسمتی ہے وہ قوم جو پھنا گئیں ایسے نادان لوگوں کے ہاتھ میں دے۔ اور اگر اس کی وجہ تھی کہ یہ لوگ اپنی قوم میں اپنی ہر دلعزیزی کو کھونے لیے تیار نہ تھے تو یہ اور بھی زیادہ افسوسناک ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان لوگوں نے اپنی پوزیشن کی خاطر ملک کو ں راستے پر جان بوجھ کر چلایا جس میں ان کے کروڑوں ہم وطنوں کی بربادی تھی۔

اس سارے کھیل میں کانگریس نے اپنے طرز عمل سے اپنے دشمنوں اور مخالفوں کی ایک ایک بات کو سچا اور اپنی ایک یک بات کو جھوٹا کر کے دکھایا۔

ہندوستان کی آزادی کے خلاف چرچل اور دوسرے انگریز مدبرین کی سب سے زیادہ پرزور دلیل یہ تھی کہ ہمارے نے ہی ملک میں فساد عظیم برپا ہو جائیگا۔ کانگریسی لیڈر اس کے جواب میں کہتے تھے کہ یہ ایک بات ہے جو تم اپنا اقتدار قائم رکھنے کے لیے بناتے ہو۔ فساد ذمہ داری کا بوجھ اہل ملک پر ڈال تو دو پھر دیکھو کہ کیسا امن اور انصاف قائم ہوتا ہے۔ ب خاتمات سے کس کو سچا اور کس کو جھوٹا ثابت کیا؟ یہ آج سارا زمانہ دیکھ رہا ہے۔

مسٹر جناح کا سب سے بڑا الزام کانگریس پر یہ تھا کہ وہ در اصل ایک متعصب ہندو قوم پرست جماعت ہے اور اس نے محض منافقت کے ساتھ ہندوستانی قوم پرستی کا لبادہ اوڑھ رکھا ہے۔ کانگریسی اس الزام کو بالکل غلط کہتے تھے لیکن انتقال اقتدار کی آمد کے بعد سے آج تک کانگریس اور اس کے لیڈروں نے جو کچھ کیا ہے وہ مسٹر جناح کے الزام کا ناقابل تردید

ثبوت ہے۔ انہوں نے خود ہی اپنے اوپر سے اس لبادے کو اتار پھینکا ہے جسے مسٹر جناح منافقت کا لبادہ کہتے تھے

کانگرس کے مخالفین کہتے تھے کہ جو سوراج کانگرس قائم کرنا چاہتی ہے وہ دراصل ہندو راج ہو گا جس میں مسلمانوں کے لئے کوئی آزادی نہ ہو گی۔ اسی اندیشے پر تقسیم ملک کی تجویز مبنی تھی اور اسی خطرے کی بنا پر مسلمانوں کی عظیم اکثریت اُس تحریک آزادی کو مشتبہ نظروں سے دیکھتی تھی جس کی علمبرداری کا "شرف" کانگرس کو حاصل تھا۔ کانگرسی لیڈر ہمیشہ مسلمانوں کے ان اندیشوں اور خطرات کو بے بنیاد قرار دیتے رہے۔ مگر ۱۵ اگست کے بعد جو کچھ ہندوستان میں ہوا اور اب تک ہو رہا ہے اس نے ان سارے اندیشوں کو بالکل صحیح ثابت کر دیا جن کی بنا پر مسلمان کانگرس کی تحریک آزادی کو اپنے لئے تحریک بربادی سمجھتے تھے۔ بلکہ درحقیقت سوراج قائم ہوتے ہی جو سلوک مسلمانوں کے ساتھ شروع ہُوا وہ تو ان بدتر سے بدتر اندازوں سے بھی بدرجہا زیادہ بدتر نکلا جو کانگرس کے شدید ترین مخالف کر سکتے تھے۔

کانگرس کا دعوٰے تھا کہ وہ ہندوستان کی وحدت کا عقیدہ رکھتی ہے اور تقسیم کو محض مسلم لیگ اور انگریزی حکومت کی زبردستی سے بادلِ ناخواستہ قبول کر رہی ہے لیکن تقسیم سے پہلے اور تقسیم کے وقت اور تقسیم کے بعد جو کچھ اس نے کیا وہ سب اس تقسیم کو دائمی اور ابدی بنا دینے والا ہے۔ اگر آدمیت سے تقسیم کا معاملہ طے کیا جاتا، شرافت سے اس پر عمل درآمد کیا جاتا اور اس کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں سے منصفانہ سلوک کیا جاتا تو بعید نہ تھا کہ کچھ مدت بعد پاکستان خود ہندوستان کے ساتھ اتحاد کا خواہشمند ہوتا مگر اب پاکستان اور ہندوستان کے درمیان وہ دیواریں کھڑی ہو چکی ہیں جو صدیوں تک انہیں ایک دوسرے سے جدا رکھیں گی۔

اب تیسرے اداکار کو لیجئے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے زیادہ ناکام رہا ہے۔

دس سال مسلمانوں کی قیادتِ عظمیٰ جس لائحہ عمل پر چل رہی تھی وہ سلطان عبدالحمید خاں کی سیاست سے ملتا جلتا تھا جس طرح وہ ۳۳ سال تک محض دولِ یورپ کی باہمی رقابتوں سے فائدہ اٹھا کر جیتے رہے اور اس دوران میں خود ترکی کی کوئی طاقت انہوں نے نہ بنائی جس کے بل بوتے پر وہ جی سکتا، اسی طرح اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگرس کی کشمکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا پورے دس سال میں اس نے خود اپنی قوم کی اخلاقی، مادی اور تنظیمی طاقت بنانے اور اس کے اندر قابلِ اعتماد سیرت پیدا کرنے کی کوئی کوشش نہ کی جس کی بنا پر وہ اپنے کسی مطالبہ کو خود اپنی طاقت

سے منوا سکتی۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جونہی انگریز یا مسلم لیگ اور کانگریس کی باہمی کشمکش ختم ہوئی اس قیادت عظمیٰ نے اپنے آپ کو ایسی حالت میں پایا جیسے اس کے پاؤں تلے زمین نہ ہو۔ اب وہ مجبور ہو گئی کہ جو کچھ جن شرائط پر بھی ملے اسے غنیمت سمجھ کر قبول کر لے۔ بنگال و پنجاب کی تقسیم اسے بے چون و چرا ماننی پڑی۔ سرحدوں کی تعیین جیسے نازک مسئلے کو اسے صرف ایک شخص کے فیصلے پر چھوڑ دینا پڑا۔ انتقال اختیارات کے لیے جو وقت اور جو طریقہ تجویز کر دیا گیا اسے بھی بلا تامل اس نے مان لیا۔ حالانکہ یہ تینوں امور صریح طور پر مسلمانوں کے حق میں مہلک تھے۔ انہی کی وجہ سے ایک کروڑ مسلمانوں پر تباہی نازل ہوئی اور انہی کی وجہ سے پاکستان کی عمارت اول روز ہی سے سخت متزلزل بنیادوں پر اٹھی۔

اس قیادت کی غلطیاں اس سے بہت زیادہ ہیں کہ چند سطروں میں انہیں شمار کیا جا سکے۔ مگر اس کی چند غلطیاں تو اتنی نمایاں ہیں کہ آج ہر ذی ہوش آدمی ان کو بری طرح محسوس کر رہا ہے۔ مثال کے طور پر۔

۱۔ اس نے حصول پاکستان کی جنگ میں اُن علاقوں کے مسلمانوں کو شریک کیا جنہیں لامحالہ ہندوستان ہی میں بسنا تھا۔ آج یہ اسی کا خمیازہ ہے کہ ہندوستان کی سرزمین اُن غریبوں کے لئے جہنم بن گئی ہے۔ حالانکہ اگر تقسیم کے بعد ہندوستانی اور پاکستانی مسلمانوں کا مستقبل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہو جانا لازماً تھا تو کوئی وجہ نہ تھی کہ تقسیم سے پہلے دونوں کی پالیسی ایک ہوتی۔

۲۔ اس نے ہندوستانی مسلمانوں کو ایک ہفتہ پہلے بھی خبردار نہ کیا کہ تقسیم کے وقت اُن پر کیا طوفان ٹوٹنے والا ہے۔ اگر فی الواقع اسے ان حالات کا اندازہ ہی نہ تھا تو اس کی غفلت و بے خبری قابل ماتم ہے۔ اور اگر اس نے جان بوجھ کر مسلمانوں کو بے خبر رکھا تو اس غداری کے لئے اسے کبھی معاف نہیں کیا جا سکتا۔ (۳) جن لیڈروں پر ہندوستان کے مسلمان آخر وقت تک اندھا اعتماد کئے ہوئے تھے وہ عین وقت پر انہیں چھوڑ کر پاکستان اٹھ آئے اور انہیں کچھ بھی نہ بتایا کہ ان کے پیچھے وہ کیا کریں۔ (۴) جو عجیب و غریب ہدایت ہندوستان کے مسلمانوں کو دی گئی وہ یہ تھی کہ ایک رات میں وہ اُن سارے اصولوں کو نگل جائیں جن پر وہ دس برس سے کانگرس کے خلاف لڑ رہے تھے۔ ۱۴ اگست کا سورج دو قومی نظریے کا کلمہ پڑھتے ہوئے غروب ہوا اور ۱۵ اگست کا سورج طلوع ہوتے ہی ہر ہندی مسلمان ہندوستانی قومیت کا معتقد بن کر اٹھے۔

(۵) پچھلے دس سال کی قومی تحریک میں اسلام کا نام جس قدر لیا گیا اس کا پچاسواں حصہ بھی مسلمانوں کے اندر اسلامی اخلاق پیدا کرنے کے لئے کام نہیں کیا گیا۔ بلکہ ان کے قومی اخلاق کو پہلے سے کچھ زیادہ ہی پست کر دیا گیا۔ یہی وجہ ہے کہ قومی جنگ میں مسلمان ان تمام اخلاقی جرائم کے مرتکب ہوئے جن کا ارتکاب ان کے حریفوں نے کیا۔ مظالم کی مقدار میں چاہے کتنا ہی فرق رہا ہو مگر مظالم کی نوعیت میں دونوں کے کارنامے ایک دوسرے سے کچھ بھی مختلف نہ رہے۔ اگر ہماری قومی قیادت نے ہمارے عوام کی اخلاقی تربیت کے لئے کوئی کوشش کی ہوتی اور اکثریت کے علاقوں کے مسلمان وہ حرکات نہ کرتے جو انہوں نے کیں، تو اقلیت کے مسلمان اس بری طرح نہ پیسے جاتے، اور آج پاکستان کی اخلاقی پوزیشن ہندوستان سے اتنی زیادہ اونچی ہوتی کہ ہندوستان اس سے آنکھ ملا کر بات نہ کر سکتا۔